سوانح وخصوصیات مصنّفین

ابومحمد عبداللہ المعروف بہ ابن المقفع

(۷۲۴ء---۷۵۹ء (۱۰۶ھ---۱۴۲ھ)

ابومحمد عبداللہ المعروف بہ ابن المقفع ایرانی تھا۔اُس کی پیدائش ''جُور'' میں ہوئی جواب فیروز آباد کے نام سے موسوم ہے۔شروع کے چند سال اپنے وطن میں تحصیل علم میں گزارے اور فارسی ثقافت اور زرتشتی مذہب سے واقفیت حاصل کی۔پھر بصرہ پہنچا یہاں اس نے عربی علوم وفنون میں مہارت پیدا کی۔جلد ہی اس کی شہرت پھیل گئی اور مختلف اُمراء کے یہاں علمی خدمات انجام دیں۔عباسی خلافت قائم ہوجانے کے بعد اُس کا تعلق خلیفہ سفاح (ابوالعباس السفاح) کے چچا عیسیٰ بن علی والئ اہواز سے ہوگیا اور اسی کے ہاتھ پر ابن المقفع نے اسلام قبول کرلیا۔وہ عیسٰی بن علی کی ملازمت ہی میں تھا کہ اُسے سفیان بن مُعاویہ والئ بصرہ نے قتل کرادیا۔اگر چہ ابن المقفع کی عمر بہت کم ہوئی لیکن اُس نے اپنی بہت سی علمی اور ادبی یادگاریں چھوڑیں جن میں پہلوی زبان کے بعض ترجمے بھی شامل ہیں۔

اس کی ایک مشہور تالیف ''کَلِیْلَۃُ وَ دِمْنَۃُ'' ہے۔اس میں جانوروں اور پرندوں کی زبان سے اخلاقی تعلیم دی گئی ہے جس کا اصلی تخاطب حکام سے ہے۔کلیلۃ اور دمنۃ دو (۲) گیدڑوں کے نام ہیں۔اس کتاب کی اصل کے بارے میں مؤرخین میں اختلاف ہے لیکن خود ابن المقفع نے دعویٰ کیا ہے کہ یہ کتاب اُس نے پہلوی زبان سے ترجمہ کی ہے اور بعد کی تحقیقات سے بھی یہی بات ثابت ہوتی ہے۔دراصل اس کی بنیاد سنسکرت کی کتاب ''پنچ تنتر'' پر ہے جس کا ترجمہ پہلے پہلوی زبان میں ہوا اور پھر اُس سے عربی میں منتقل ہوئی۔''کلیلۃ ودمنۃ'' کئی دفعہ طبع ہوئی ہے اور عربی سے دنیا کی بعض اور زبانوں میں بھی اس کے ترجمے ہو چکے ہیں۔

الخنساء: تماضر بنت عمرو

(۵۷۵ء---۶۶۴ء (۴۴ھ)

خنسا اسلام سے قبل قبیلہ مضر کے ایک دولتمند سردار کے گھر میں پیدا ہوئی اور بچپن ہی سے شعر کہنے لگی۔ اس کو اپنے دو بھائیوں مُعاویہ اور صخر سے بیحد محبت تھی۔وہ دونوں ایک لڑائی میں مارے گئے۔اس کا اثر خنسا کے دل پر اتنا گہرا ہوا کہ اس کی ساری زندگی نوحہ و ماتم کے لئے وقف ہوگئی۔اب اس کے اشعار اس کے خونِ جگر سے رنگین ہوکر زبان سے نکلتے تھے۔کچھ عرصہ کے بعد وہ اپنے قبیلہ کے ساتھ مُسلمان ہوگئی۔اسلام نے اسے صبر سکھایا چنانچہ جنگِ قادسیہ میں اس کے چار لڑکے ایک ساتھ شہید ہوگئے پھر بھی اس نے اُف نہ کیا البتہ بھائیوں کے غم میں مرتے دم تک روتی رہی۔

خنساء کے کلام میں سلاست و روانی اور لطافت ونرمی بہت زیادہ ہے۔آورد (بناوٹ) اور تکلف کا تو نام ونشان تک

نہیں ہے۔جدّت طرازی اور معنی آفرینی بھی بہت کم ہے۔درحقیقت وہ شعر کو گڑھتی اور بناتی نہیں ہے بلکہ شعر اس کی زبان سے ازخود نکلتا ہے۔اس کی شاعری اس کے دردمند دل کی آواز اور اس کے المناک جذبات کی تصویر ہے۔سارا کلام سوز و گداز اور درد واثر سے بھرا ہوا ہے جو کانوں سے گذر کر براہ راست دل کے تاروں کو چھیڑتا ہے۔اس کی شاعری کا اکثر حصّہ مرثیوں پر مشتمل ہے جس میں وہ بار بار اپنے بھائیوں کو یاد کر کے روتی ہے۔ان کے محاسن کی تعریف کرتی ہے۔اور اپنے قبیلہ کو انتقام کے لئے برانگیختہ کرتی ہے۔حقیقت یہ ہے کہ عورتوں میں اس درجہ کی کوئی شاعرہ نہیں ہوئی اور مردوں میں بھی ایسے شعراء کم ہی ملیں گے جو مرثیہ گوئی میں اس کا مقابلہ کر سکیں۔

ابوعبداللہ محمد بن اسماعیل البخاریؒ

(۸۱۰ء---۸۷۰ء (۱۹۵ھ---۲۵۷ھ)

ابوعبداللہ محمد بن اسماعیل البخاریؒ کی پیدائش جیسا کہ اُن کے نام سے ظاہر ہے بخارا میں ہوئی۔اُن کی کتاب '**الجامع الصحیح**' کا درجہ حدیث کی چھ مستند کتابوں صحاح ستہ میں سب سے بلند ہے۔حالتِ یتیمی میں پرورش پائی، پہلے قرآن حفظ کیا اور پھر حدیث کی تعلیم حاصل کرنے میں مشغول ہو گئے۔اس سے انھیں احادیث جمع کرنے کی طرف توجہ ہوئی چنانچہ مکہ آئے اور وہاں اس کام میں مصروف رہے۔اسی سلسلے میں انھوں نے خراسان، ایران، عراق، شام، مصر وغیرہ کا سفر کیا اور اس میں سولہ سال صرف کئے۔کئی لاکھ حدیثیں جمع کیں جن میں صحیح اور ضعیف دونوں طرح کی حدیثیں تھیں۔اپنی کتاب 'الجامع الصحیح' میں انہوں نے '۷۲۷۵' حدیثیں رکھیں ہیں۔ان احادیث کو امام بخاریؒ نے '**الجامع الصحیح**' میں موضوعات کے اعتبار سے ترتیب دیا ہے۔مثلاً نماز، روزہ، حج، جہاد وغیرہ کے باب باندھکر ان سے متعلق احادیث کو بابوں کے تحت درج کیں ہیں۔بعض حدیثیں بعض وجوہ سے مکرّر بھی آ گئی ہیں اور اس طرح کل تعداد ۹۲۰۰ تک پہنچ جاتی ہے۔اس کتاب کا درجہ اکثر مسلمانوں کے نزدیک قرآن کے بعد سب سے بلند ہے اور وہ اس کے مؤلف کو امام کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔امام بخاری کا انتقال سمرقند کے قریب ایک گاؤں میں ہوا اور وہی سپرد خاک کئے گئے۔

سید مصطفےٰ لطفی المنفلوطی

(۱۸۷۶ء---۱۹۲۴ء (۱۲۹۳ھ---۱۳۴۳ھ)

سید مصطفےٰ لطفی المنفلوطی کا جدید عربی ادب کے نامور ادیبوں میں شمار ہوتا ہے۔تعلیم ازہر میں ہوئی جہاں وہ لغت اور علوم دین کی تحصیل کی طرف زیادہ متوجہ ہوئے۔وہاں دوسرے علماء کے علاوہ انھیں شیخ محمد عبدہ سے مستفید ہونے کا موقع ملا۔کچھ دنوں کے بعد منفلوطی، شیخ کے محبوب تلامذہ اور خاص دوستوں میں ہو گئے۔شیخ کی وفات کے بعد وہ ازہر سے قطع تعلق کر کے منفلوط میں آ کر زندگی گزارنے لگے۔ابتدا میں انھیں شاعری سے بھی دلچسپی تھی لیکن جلد ہی وہ نثر نویسی کی طرف متوجہ

ہو گئے ۔۱۹۰۷ء میں انھوں نے اخبارات میں مضامین لکھنے شروع کئے ۔یہی مضامین بعد کو النظرات میں شائع ہوئے ۔جو اُن کی شہرت کی بنیاد ثابت ہوئے ۔۱۹۰۹ء میں جبکہ سعد زغلول پاشا عہدہ وزارت سنبھالے ہوئے تھے منفلوطی کو ''وزارتِ معارف عمومیہ'' میں مُحرر عربی کا عہدہ ملا۔ بعد کو وہ ''جمعیۃ تشریعیۃ'' میں منتقل ہو گئے اور پھر وہاں سے ان کی خدمات ''دیوان ملکی'' نے حاصل کر لیں جہاں وہ بطور سکریٹری کام کرتے رہے۔

ان کی تصانیف اکثر طبع زاد (اپنی ایجاد یا اختراع) ہیں اور کچھ یورپ کے مشہور مصنفین کی تصانیف سے ماخوذ ہیں ۔ان کی تصانیف میں سب سے اہم '' النظرات'' (۱۹۰۲ء تا ۱۹۱۰ء) ہے ۔دورِ جدید کی عربی کتابوں میں سے کوئی کتاب اس کی ہر دل عزیزی کو آج تک نہیں پہنچ سکی ۔اِس لئے کہ اس سلاست و روانی کے مضامین اس سے پہلے ادبِ عربی میں موجود نہ تھے۔

منفلوطی کی خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے اپنے آپ کو عام تقلیدی رنگ سے آزاد کیا اور اس عہد میں انشاء کا جو بندھا بندھایا فرسودہ سا اُسلوب رائج ہو گیا تھا اس سے اپنے کو بڑی کامیابی کے ساتھ نکالا ۔جب کہ عام ادیب الفاظ کے ظاہری حسن اور جملوں کی تراش وخراش میں مصروف تھے، انہوں نے مصر کی معاشرتی زندگی کی اصلاح کی طرف توجہ کی اور پے در پے مضامین وہاں کے اجتماعی و معاشرتی حالات پر سپردِ قلم کئے ۔

منفلوطی کا نقص یہ ہے کہ وہ تشاؤم کی طرف مائل ہے ۔اسے معاشرے میں رنج و مایوسی اور انسانی زندگی میں خرابی و بربادی کے سوا کچھ اور نظر نہیں آتا وہ فطرتاً جذباتی واقع ہوئے تھے، اس لئے انسان کی فطرت کے تاریک پہلو پر ہمیشہ ان کی نظر تیز پڑتی ہے ۔زندگی ان کے لئے وادیٔ عبرت تھی جس سے بچنے کے لئے وہ تخیل کی طرف رجوع کرتے تھے، وہ کہتے ہیں:

''میری نظر میں حسنِ تخیل، حسنِ حقیقت سے زیادہ مرغوب ہے، خوبصورت شہروں کا حال تو میں پڑھنا چاہتا ہوں مگر اُن کو آنکھوں سے دیکھنا قطعاً نہیں چاہتا، گویا مجھ کو ڈر ہے کہ اصل چیز مجھ سے میری خیالی خوشی نہ چھین لے۔''

جبران خلیل جبران

۱۸۸۳ء---۱۹۳۱ء (۱۳۰۱ھ---۱۳۵۰ھ)

جبران خلیل جبران شمالی لبنان میں پیدا ہوئے اور وہیں انھوں نے ابتدائی تعلیم و تربیت حاصل کی ۔(۱۸۹۵ء میں وہ امریکہ چلے گئے جہاں انھوں نے مصوّری (تصویریں بنانے کا پیشہ، آرٹ) کی تعلیم حاصل کی ۔کچھ دنوں کے بعد وہ بیروت واپس ہوئے ۔اور چار سال وہاں رہ کر ۱۹۰۸ء میں وہ پیرس روانہ ہوئے ۔وہاں تین سال رہ کر انھوں نے مصوّری کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی ۔اس عرصے میں وہ روم، برسلز، لندن اور یورپ کے دوسرے مقامات جاتے رہے اور مشہور مصوّروں سے ملتے رہے اور اُن سے مستفید ہوتے رہے ۔پیرس میں وہ مشہور مصوّر اور سنگ تراش روداں (RODIN؛ ۱۸۴۰ء۔۱۹۱۷ء) کے شاگرد ہوئے جس نے انگریز شاعر اور مصوّر ولیم بلیک (۱۷۵۷۔۱۸۲۷) کے فن سے انھیں روشناس کرایا اور جس کا بعد میں

جبران کے فن پر بڑا گہرا اثر پڑا۔ نیویارک پہنچ کر انھیں نٹشے (۱۸۴۴۔۱۹۰۰) کی تحریرات سے واقفیت کا موقع ملا اور وہ اس المانوی (German) مفکر کے فلسفے سے بہت متاثر ہوئے۔

اپنے عہد کی معاشرت پر جبران کی نظر ہمیشہ تنقیدی پڑتی ہے اور وہ اپنے معاشرے کے عیوب خوب ڈھونڈ نکالتا ہے۔ وہ سرمایہ داروں سے بہت بیزار ہے اور وہ دولت کو غرباء پر ظلم و استبداد کا ذریعہ بتاتا ہے۔ جبران کو مذہب سے کوئی دلچسپی نہیں؛ کسی مذہب سے بھی نہیں۔ وہ جب کسی نبی پر لکھنے بیٹھتا ہے تو اس کی لکھائی اصل حقیقت سے دور ہوتی ہے۔

جبران کی نثر بہت خوبصورت اور رواں ہے۔ الفاظ کی چمک دمک سے آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں اور کہیں کہیں وہ الفاظ کی موسیقی سے اس طرح جادو جگاتا ہے کہ انسان مسحور ہو کر رہ جاتا ہے۔

جبران کی تصانیف میں "**دمعة وابتسامة** (۱۹۱۳)"، "**الأرواح المتمرّدة**" اور "**الأجنحة المنكسرة** (۱۹۱۸)" مشہور ہیں۔ جبران کی پندرہ (۱۵) سے زائد کتابیں یا تو انگریزی میں ہیں یا انگریزی میں ترجمہ ہو چکی ہیں۔ ان میں "**النّبیّ**"، "**المجنون**" اور "**یسوع بن الانسان**" خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

ڈاکٹر طٰہٰ حسین

۱۹۷۳ء

طٰہٰ حسین، مصر کے ایک ایسے علاقے میں پیدا ہوئے جہاں دیہات کی زندگی کی ساری روایات پر سختی سے پابندی کی جاتی ہے۔ ابھی وہ کم عمر ہی تھے کہ ان کی بصارت جاتی رہی۔ انھیں ایک چھوٹے سے مدرسہ میں داخل کیا گیا جہاں کی تعلیم ختم کر کے وہ ازہر میں داخل ہوئے۔ یہاں انھیں شیخ المرصفی اور دوسرے اساتذہ کی شاگردی میں عربی ادب کا سچا ذوق پیدا ہوا کچھ دنوں کے بعد وہ قاہرہ کی یونیورسٹی میں داخل ہوئے جہاں انھیں پروفیسر نالینو اور پروفیسر لتمان جیسے مستشرقین سے مستفید ہونے کا موقع ملا اور اس طرح مغربی طریقہ فکر اور طریقہ تنقید سے انھیں آگاہی ہوئی۔ ۱۹۱۴ء میں انھوں نے ابوالعلاء المعرّی (م ۴۴۹ھ) سے متعلق ایک تحقیقی مقالہ لکھ کر اپنی یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ ڈگری حاصل کی۔ یہ مقالہ کتابی شکل میں ذکریٰ ابی العلاء (۱۹۱۵ء) کے نام سے شائع ہوا۔ جنگ عظیم کے دوران میں وہ پیرس میں فرانسیسی ادب اور ادبی تنقید کے مختلف اسالیب کا مطالعہ کرتے رہے۔ ان کی جامعاتی زندگی ۱۹۰۹ء میں ختم ہو جاتی ہے۔ جب اُنھوں نے "ابن خلدون مقدمہ اور تنقید" لکھ کر پیرس سے دوسری ڈاکٹریٹ ڈگری حاصل کی۔

مصر واپس آ کر وہ جامعہ قاہرہ میں قدیم یونانی اور رومن تاریخ اور کچھ عرصہ بعد قدیم عربی ادب کے پروفیسر مقرر ہو گئے۔ اس زمانے میں انھوں نے حدیث الاربعاء (۱۹۲۵ء) لکھی جس میں اسلامی ثقافت اور عربی ادب پر بہت مفید اور قیمتی اشارے ملتے ہیں لیکن جس کتاب نے مصر بلکہ پورے عالم اسلام میں ایک طوفان برپا کر دیا۔ وہ ان کی تصنیف الشعر الجاھلی (۱۹۲۶) ہے جو زمانہ قبل از اسلام کی شاعری پر لکھی گئی ہے جس میں ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ یہ شاعری زیادہ تر ظہورِ اسلام کے بعد بعض مصالح کی بنا پر واضعین نے وضع کی ہے۔ انھوں نے مصالح میں مذہبی مصالح کا بھی ذکر کیا تھا۔ مزید

برآں یہ کہ وہ ابراہیم واسماعیل (علیہما السلام) کے تاریخی وجود سے منکر ہوئے جس سے راسخ العقیدہ مسلمانوں کے جذبات بہت برانگیختہ ہوئے۔نتیجہ یہ ہوا کہ کتاب ممنوع الاشاعت قرار دے دی گئی اور انھیں قابل اعتراض حصے حذف کر کے کچھ نئے صفحات کا اضافہ کرنا پڑا۔اب یہ کتاب **الأدب الجاهلي** (۱۹۲۲) کے نام سے شائع ہوئی۔

ان کی تصانیف کی تعداد خاصی ہے۔ان کی خودنوشت سوانح حیات 'الأيّـام (۱۹۲۶ء۔۱۹۲۷ء)' سب سے مقبول اور کامیاب تصنیف ہے اور یہ کتاب بلاشبہ جدید مصری ادب کی بہترین کتابوں میں شمار کی جاسکتی ہے۔

توفیق الحکیم

۱۹۰۳ء

توفیق الحکیم ایک ایسے گھرانے میں پیدا ہوئے جو مصری دیہی اور ترکی النسل شرفاء کے خاندانوں کا امتزاج تھا۔بچپن اپنے والد کے گاؤں میں گذارا اور قریب کے شہر منہور میں ابتدائی تعلیم مکمل کی۔بعد ازاں قاہرہ میں محمد علی سکنڈری اسکول میں ۱۹۱۵ء میں داخلہ لیا۔۱۹۲۱ء میں قانون کی تعلیم شروع کی اور ۱۹۲۵ء میں قانون میں گریجویشن کرنے کے بعد ڈاکٹریٹ کرنے کی غرض سے فرانس گئے۔

پیرس پہنچ کر توفیق الحکیم نے محسوس کیا کہ قانون کا مزید مطالعہ ان کے مزاج کے مطابق نہیں ہے، چنانچہ قانون کی تعلیم کو نظر انداز کر کے ادب اور موسیقی کی طرف متوجہ ہوئے۔اور فرانسیسی زبان کے ذریعہ یورپی ادب خصوصاً افسانوی ادب سے پوری طرح واقفیت حاصل کی۔

پیرس کے قیام کے دوران ہی توفیق الحکیم نے ایک ڈرامہ نگار کی حیثیت سے اپنی ادبی زندگی کا آغاز کیا اور اپنا مشہور ڈرامہ ''امام شباک التذاکر'' فرانسیسی زبان میں قلمبند کیا جس کو مشہور عربی صحافی احمد بصاوی محمد نے عربی جامہ پہنا کر ۱۹۳۵ء میں رسالہ ''مجلتی'' میں پہلی مرتبہ شائع کیا۔

توفیق الحکیم کی ادبی زندگی کا آغاز اگر چہ قیام پیرس کے زمانے میں ہوا لیکن اس سے قبل قاہرہ میں قیام کے دوران کی ادبی اور شعوری زندگی کی لمع سازی شروع ہو چکی تھی۔چنانچہ اسی زمانہ میں انہوں نے کئی ایک ڈرامے تخلیق کئے تھے جو بعض عوامی تھیٹر گھروں میں اسٹیج بھی کئے گئے مگر ان ڈراموں کو انکی ابتدائی شکل کے پیش نظر توفیق الحکیم کی تصنیفات میں شامل نہیں کیا گیا، ان ڈاموں میں سے ''**المرأة الجديدة**'' ''**العريس**'' ''**خاتم سليمان**'' اور ''**علي بابا**'' کو ایک زمانے میں کافی شہرت حاصل تھی۔

اگر چہ توفیق الحکیم عنفوانِ شباب سے ہی فن قصہ نویسی اور ڈرامہ نویسی سے شغف رکھتے تھے مگر ان کے اس ادبی رجحان کو فرانس کے دورانِ قیام میں جلا ملی جب انھوں نے یورپین ادب اور خاص طور سے فرانسیسی ادب کا مطالعہ کیا اور اس کے فنی اور اسلوبی اثرات کو اپنانے اور ہضم کرنے کی صلاحیتوں کا اپنی تحریروں میں مظاہرہ کیا۔۱۹۲۵ء سے ۱۹۲۸ء تک فرانس کے

دورانِ قیام توفیق الحکیم نے ایک طرف ڈرامہ نویسی کے فنی ارتقاء کا اور دوسری جانب افسانہ نگاری کے مختلف پہلوؤں کا گہری نظر سے مطالعہ کیا جس کے نتیجہ میں وطن واپس آنے کے بعد اپنی ادبی کاوشوں کو تیز تر کر دیا۔

عرصہ تک بحیثیت پبلک پراز یکیوٹر حکومت کی ملازمت کے دوران جن تجربات واحساسات سے سابقہ پڑا انکو ایک ناولٹ کی شکل میں ''یومیات نائب فی الاریاف'' کے نام سے قارئین کی خدمت میں پیش کیا۔توفیق الحکیم کی یہ کتاب ان تصنیفات میں سے ہے جن کو نہ صرف مصر میں بلکہ بیرون دنیائے عرب میں بھی خاطر خواہ شہرت ومقبولیت حاصل ہوئی۔اس سے قبل ان کے مشہور ڈرامہ ''**اهل الكهف**'' کا ادبی حلقوں میں کافی چرچا ہو چکا تھا۔

توفیق الحکیم نے ایک جانب عربی ادب کو فنی ڈرامہ نویسی سے روشناس کرایا تو دوسری جانب قصہ نگاری کے میدان میں نئے آفاق تلاش کئے چنانچہ جس طرح ان کے ڈراموں نے بین الاقوامی شہرت حاصل کی۔اسی طرح ان کے ایک دوسرے ناول ''**عودة الروح**'' (جسے ذاتی سوانح حیات بھی کہا جاسکتا ہے) نے بھی عالمی شہرت حاصل کی اور دنیا کی مختلف اہم زبانوں میں اس کا ترجمہ کیا گیا ہے۔

محمود سامی البارودی

۱۸۳۸ء---۱۹۰۴ء (۱۲۵۵ھ---۱۳۲۲ھ)

محمود سامی البارودی کا تعلق جرکسی خاندان سے تھا جسے قدیم زمانہ سے عزت وشہرت حاصل تھی۔ان کے والد حسن حسنی البارودی توپ خانے کے اعلیٰ افسر تھے اور بعد میں محمد علی پاشا کے عہدِ حکومت میں بر براور دنقلہ کے گورنر رہے تھے۔وہ ''بارودی'' اس بناء پر کہے جاتے ہیں کہ ان کا آبائی وطن صوبۂ بحیرہ میں واقع ''ایتامی البارود'' تھا۔ان کے آباؤاجداد کا شمار عہد ممالیک کے مصر کے حکام میں ہوتا ہے۔

بارودی سات برس کی عمر میں یتیم ہو گئے اور انھیں باپ کی شفقت سے محروم ہونا پڑا۔ان کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ بارہ برس کی عمر میں وہ فوجی اسکول میں داخل ہو گئے۔۱۸۵۴ء میں جب انکی عمر ۱۶ سال تھی انھوں نے اس اسکول کی تعلیم مکمل کرلی۔یہ عباس اول کا دورِ حکومت تھا۔تعلیم سے فارغ ہوکر البارودی نے اپنا اکثر وقت قدماء کی تحریروں کا مطالعہ کرنے میں صرف کیا۔شعری ملکہ قدرت نے انھیں ابتدا ہی سے ودیعت کیا تھا،اسی لئے فخر وحماسہ کی شاعری ان کے مطالعہ کا خصوصی موضوع بنی۔چنانچہ جب انھوں نے خود شعر کہنا شروع کیا تو اپنے ہم عصروں کے بخلاف مدحیہ شاعری کو اپنی توجہ کا مرکز نہیں بنایا بلکہ امروالقیس،ابن المعتز،شریف رضی اور ابوفراس کی شاعری کی تقلید کرنے کی کوشش کی۔

انھیں اپنی جولانی طبع کے لئے مصر کی سرزمین تنگ محسوس ہوئی،اس لئے وہ قسطنطنیہ چلے گئے جہاں جا کر وزارت خارجہ سے منسلک ہو گئے اور ترکی اور فارسی زبان وادب میں مہارت حاصل کی اور ان دونوں زبانوں میں بھی شعر کہے۔ ۱۸۶۳ء میں اسماعیل پاشا (والیٔ مصر) نے جب ترکی کا سفر کیا تو وہاں انکی مُلاقات بارودی سے ہوئی۔بارودی کو ان کی ذات میں جاذبیت محسوس ہوئی اور وہ ان سے وابستہ ہوکر مصر واپس آگئے۔اب انکی جنگی خدمات کا دور شروع ہوا اور انھوں نے فوج

میں مختلف مناصب حاصل کئے یہاں تک کہ لفٹننٹ کرنل کے عہدے تک پہنچے۔انھوں نے جزیرۂ کریت کی جنگ میں حصّہ لیا اوراس جزیرے کے قدرتی مناظر سے متاثر ہوئے۔ان کی اس دور کی شاعری میں ان مناظر کے جمال اور جنگی معرکوں کے جلال دونوں کی بیک وقت نقش آرائی ہے۔

بعد میں بارودی نے بعض اہم سیاسی خدمات بھی انجام دیں اور مصر کے نظم ونسق میں اسماعیل پاشا کے ممدّ و مُعاون رہے۔مختلف جنگوں میں کارہائے نمایاں انجام دیئے جن کے نتیجہ میں میجر جنرل کا عہدہ حاصل کیا اور متعدد انعامات اور تمغوں سے سرفراز ہوئے۔ان جنگوں کے آثار بھی اپنی شاعری میں پیش کرتے ہیں۔انھوں نے چالیس سال کی عمر میں جنگ بلقان میں بھی حصّہ لیا اور وہاں سے واپس آ کر صوبۂ شرقیہ کے گورنر اور اس کے بعد دارالحکومت کے محافظ مقرر ہوئے۔

جب توفیق پاشا سریر آرائے حکومت ہوئے تو انھوں نے بارودی کو وزیر اوقاف مقرر کیا اور کچھ ہی مدت کے بعد وزیر جنگ بھی بنادیا۔اگر چہ بارودی، حکومت کی مشینری کا ایک اہم جز تھے لیکن چونکہ وہ جمال الدین افغانی کے معتقد اور اصلاحات کے حامی بھی تھے اس لئے توفیق پاشا ان کے بارے میں مشکوک ہوگئے اور نتیجتاً انہیں وزارت سے برطرف کردیا اور وہ سیاست سے کنارہ کش ہوکر دیہات میں سکونت پذیر ہوگئے لیکن تھوڑی ہی مدت کے بعد حالات نے رُخ بدلا اور فوج میں بے چینی پیدا ہوئی۔توفیق پاشا نے پھر ان کی ضرورت محسوس کی اور انھیں وزارت میں شامل ہونے پر مجبور کیا۔جلدی ہی وہ وزارت عظمٰی کی کرسی پر متمکن ہوگئے۔وزیر اعظم مقرر ہونے کے بعد انھوں نے فوجی شورش کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی لیکن پانی سر سے اونچا ہو گیا تھا،فوج توفیق پاشا کی معزولی پر مُصر تھی۔بارودی کے دل میں بھی یہ خواہش پیدا ہوئی کہ وہ اپنے اجداد کی مانند مصر کے حاکم بنیں۔چنانچہ اُنھوں نے اپنی قسمت انقلابیوں کے ساتھ، جن کے قائد عرابی پاشا تھے، وابستہ کردی لیکن بیرونی طاقتوں، بالخصوص انگریزوں اور فرانسیسیوں، کی دخل اندازی کے بسبب پانسہ پلٹ گیا اور بارودی کو اپنے رُفقاء کے ساتھ لنکا میں جلاوطن ہونا پڑا۔انھوں نے جلاوطنی کی طویل زندگی گزاری جس کے دوران انگریزی زبان وادب سے واقفیت حاصل کی۔

انکی زندگی کا یہ دوران کی شاعری کے حق میں بہت مفید ثابت ہوا۔اس دوران انھوں نے اعلیٰ درجہ کی شاعری کی جو ان کے ذاتی غم، حبّ وطن اور ماحول کی عکاسی سے مملو ہے۔انھوں نے اپنے آپ کو وطن اور اہل وطن کے حالات سے باخبر رکھا اور ان کے اعزہ واحباب میں سے جن لوگوں نے انھیں داغِ مُفارقت دیا ان کے مرثیے لکھے جن میں خود اپنے عہدِ شباب کی یادوں کو بھی تازہ کیا۔چنانچہ اس صنفِ سخن میں ان کا مقام عالمِ عرب میں مُسلّم ہوگیا۔ ۱۹۰۰ء میں، حکومت کے فیصلے کے مطابق، بارودی اور دوسرے جلاوطنوں کو مصر واپس بلالیا گیا۔اگر چہ اب ان کی زندگی کی شام ہو چلی تھی تاہم مصر کے ادبی حلقوں میں اُن کا کھلے دل کے ساتھ استقبال کیا گیا۔اور ان کا گھر اہل ادب کا مرجع بن گیا۔جلاوطنی سے واپسی میں وہ اپنے ساتھ اہل مصر کے لئے ایک لازوال تحفہ لائے اور وہ ان کی شاعری تھی۔وطن واپس آ کر وہ اپنے دیوان پر نظر ثانی کرنے اور عباسی دور کے شعراء کا ایک ضخیم انتخاب ترتیب دینے میں مصروف رہے تا آنکہ دسمبر ۱۹۰۴ء میں انکی وفات ہوگئی۔

بارودی کا دیوان پہلے ان کی بیوی نے دوحصوں میں طبع کرایا تھا بعد میں اسے علی الجارم اور محمد شفیق معروف کی تہذیب وتصحیح کے ساتھ دوبارہ دوجلدوں میں شائع کیا گیا۔ان کا مرتب کیا ہوا عباسی دور کے شعراء کے کلام کا انتخاب چار جلدوں میں

شائع ہوا جوان کے حسنِ ذوق و وسعتِ مطالعہ اور تنقیدی صلاحیت پر دلالت کرتا ہے ۔اس انتخاب میں تیس عظیم شاعروں کا کلام شامل ہے۔کہا جاتا ہے کہ بارودی نے ''قیدالأوابد'' کے نام سے نثر کا ایک انتخاب بھی مرتب کیا تھا لیکن افسوس ہے کہ یہ انتخاب زیورِ طبع سے آراستہ نہیں ہوسکا۔

ابتدا میں بارودی نے اپنی شاعری میں قدیم اساتذہ کے طرز کی پیروی کی تھی لیکن بعد میں جداگانہ راہ اختیار کی۔اس کا سبب ان کی اپنی زندگی کا مدوجزر تھا۔ان کا کلام اُن کے دَور اور خود ان کی اپنی زندگی کا پوری طرح آئینہ دار ہے۔ان کے یہاں ہمیں نسیب ، وصف ، رثاء ،ہجو ، مدح ،فخر اور حکمت ہر طرح کا کلام ملتا ہے۔ان کی وصفیہ شاعری کی سب سے بڑی خصوصیّت جذبے کی صداقت اور مناظر فطرت سے ہم آہنگی ہے۔ان کی مدح دنایتِ نفس سے پاک ہے اور ہجو میں شخص عنصر کا فقدان ہے۔اشخاص کے بجائے انھوں نے سماجی خرابیوں پر طنز کیا ہے۔بارودی نے سیاسی شاعری بھی کی ہے۔اِس شاعری میں ان کی اپنی شخصیت ہر جگہ سر اُٹھاتی نظر آتی ہے اور وہ ظلم و ناانصافی سے بغاوت اور انصاف و مساوات کی تلقین کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔الغرض جدید عربی شاعری میں بارودی کا مرتبہ بہت بلند ہے کیوں کہ ایک طرف انھوں نے اس کا درجہ عباسی دور کے عظیم شعراء کے کلام کی سطح تک اونچا کردیا اور دوسری طرف اس میں جدید معانی و مطالب اور افکار و نظریات کی آمیزش کرکے اسے اپنے اہل وطن کے لئے ایک پیغام کی حیثیت دے دی اور یہ ثابت کردیا کہ ''شاعری جزولیست از پیغمبری''۔

احمد شوقی

(۱۲۸۸ھ---۱۳۵۱ھ) ۱۸۶۸ء---۱۹۳۲ء

احمد شوقی قاہرہ میں پیدا ہوئے اور وہیں ابتدائی و ثانوی تعلیم حاصل کی۔ابھی کم سن ہی تھے کہ ''مدرستہ الحقوق'' میں داخلہ لیا پھر ''مدرستہ الترجمۃ'' سے ملحق ہوگئے اور مؤخرالذکر مدرسہ سے ڈگری حاصل کی۔۱۸۸۷ء میں خدیو توفیق بن اسماعیل کے خرچ پر اعلیٰ تعلیم کے لئے فرانس گئے۔وہاں تین سال میں قانون کی تعلیم مکمل کرکے ڈگری حاصل کرلی۔تکمیل تعلیم کے بعد پیرس میں تقریباً چھ ماہ مزید قیام کیا۔اس مدت میں پیرس کے مشہور کتب خانوں سے مستفید ہوئے اور یورپی تہذیب و تمدن کا عمیق نظر سے مطالعہ کیا۔۱۸۹۱ء میں ترکی ہوتے ہوئے مصر لوٹ آئے۔

۱۸۹۱ء سے ۱۹۱۵ء تک کا زمانہ ثروت و امارت کے لحاظ سے احمد شوقی کی زندگی کا بہترین زمانہ ہے۔اس درمیان میں وہ شاعرالضریز کے لقب سے معروف تھے۔۱۸۹۴ء میں مؤتمر المستشرقین جینوا میں منعقد ہوئی جس میں انھوں نے حکومت مصر کی نمائندگی کی۔۱۹۱۵ء سے ۱۹۱۹ء تک کا زمانہ ان کی جلاوطنی کا ہے جس میں وہ مصر سے باہر رہے اور اسپین میں قیام کیا۔اس جلاوطنی کے سانحہ سے ان کے دل میں اپنے ملک و قوم کی محبت شدید سے شدید تر ہوگئی۔۱۹۱۹ء میں جب مصر کی سیاسی حالت کچھ بہتر ہوئی تو وہ پھر مصر واپس آگئے۔

۱۹۱۹ء سے ۱۹۳۲ء تک شوقی کی زندگی مکمل طور پر ادبی زندگی ہے۔۱۹۲۷ء میں ان کے اعزاز میں ایک عظیم الشان جلسہ منعقد کیا گیا جس میں بلادِ عربیہ کے مشہور اُدَباء و شعراء جمع ہوئے اور ان کی ادبی خدمات کا اعتراف کیا یہی نہیں بلکہ امیر

الشعراء کے ممتاز لقب سے بھی نوازا۔

شوقی کا دیوان شوقیات کے نام سے مشہور ہے۔ یہ دیوان چار جلدوں میں شائع ہو چکا ہے۔ اس دیوان کے علاوہ، انھوں نے متعدد ڈرامے اور کئی ناولیں بھی لکھی ہیں۔ ڈراموں میں زیادہ مشہور ''کلوپاترا'' اور ''مجنوں ولیلیٰ'' ہیں۔

شوقی کی شاعری تین ادوار میں منقسم ہے:

(۱) پہلا دَور (۱۸۹۱ء۔۱۹۱۵ء) اس زمانے کی شاعری اپنے موضوع و اسلوب کے اعتبار سے قدیم شعراء کے طرز پر ہے۔ اس کا بیشتر حصہ طویل قصائد پر مشتمل ہے جن کو بہ لحاظ موضوع مدح، مرثیہ، غزل، فخریات اور خمریات وغیرہ میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ اگر چہ اس زمانے کی شاعری کو تقلیدی شاعری کا نام دیا جا سکتا ہے مگر تعبیرات میں جدّت اور تراکیب میں نرالا پن ہے بیان میں صفائی اور سلاست ہے۔ تمثیلات و تشبیہات اور استعارے نئے ہیں۔ شعر میں نفسیاتِ انسانی کا ایک عمیق مطالعہ موجود ہے۔

(۲) دوسرا دَور (۱۹۱۵ء۔۱۹۱۹ء) شوقی کی زندگی کا یہ دور جلاوطنی کا دور ہے۔ انھیں اس زمانے میں اپنی حرماں نصیبی کا احساس ہوا۔ اس احساس نے ان کے ذاتی غم کو وسعت بخشی اور وہ غمِ انسانیت میں تبدیل ہو گیا۔ اس دور کی شاعری میں انھوں نے نہ صرف اپنے غم و الم کا گیت گایا بلکہ غم انسانیت کی بھی عکاسی کی۔ انقلابِ زمانہ کا گہری نظر سے مطالعہ کیا اور سماج کی نئی دنیا میں قدم رکھا اور اپنی شاعری کا موضوع سماج بنایا۔

(۳) تیسرا دور (۱۹۱۹ء۔۱۹۳۲ء) جلاوطنی کے بعد شوقی کا دل اپنے وطن و قوم کی محبت سے معمور ہو جاتا ہے۔ وطن کی ابتری پر آنسو بہاتے ہیں۔ قوم کی فلاح و بہبود کے لئے نظمیں لکھتے ہیں۔ ان نظموں میں نہ صرف مصری قوم کے لئے بلکہ انسانیت کے لئے فلاح و امن کا ایک پیغام ہے۔ اِسی طرح اپنی قوم کے جذبۂ عمل کو اُبھارتے رہے اور تادمِ آخر شاعرِ نیل کے لقب سے موسوم رہے۔

محمد حافظ بن ابراہیم فہمی

(۱۲۸۸ھ۔۱۳۵۱ھ) ۱۸۷۱ء۔۱۹۳۲ء

پورا نام محمد حافظ بن ابراہیم فہمی ہے لیکن عرفِ عام میں حافظ ابراہیم کے نام سے مشہور ہیں۔ وہ مصر کے 'ویروط' نامی ایک قصبہ میں پیدا ہوئے۔ بچپن ہی میں ان کے والد ماجد کا انتقال ہو گیا۔ ابتدائی و ثانوی تعلیم حاصل کرنے کے بعد تھوڑی مدت تک طنطا میں قیام کیا اور یہیں انھیں مطالعہ کتب اور شاعری سے ذوق پیدا ہوا۔ پھر کچھ عرصہ بعد فوجی مدرسہ میں داخل ہوئے اور اپنی فطری صلاحیت کی بنا پر فوج میں افسر مقرر ہو کر مصری فوج کے ساتھ سوڈان بھیجے گئے مگر دیگر فوجی افسروں سے اختلاف ہونے کی وجہ سے ملازمت سے علیحدہ کر دیئے گئے۔ اسی زمانے میں ان کی تمام توجہ شعر و سخن کی طرف مبذول ہو گئی۔ ملک کے مشہور و معروف اُدَباء و شعراء سے تعلقات پیدا کئے اور ان کے علم و فن سے فائدہ اُٹھایا۔ اسی اثناء میں ان کی ملاقات شیخ محمد عبدہ سے ہوئی۔ اور ان کے علم و ادب سے مستفید ہونے کا موقع ملا۔ ۱۹۱۱ء میں دارالکتب المصریہ کے شعبۂ ادب کے

صدر مقرر ہوئے اور زندگی عیش وعشرت سے بسر ہونے لگی۔

حافظ انتہائی رقیق القلب واقع ہوئے تھے۔ان کی طبیعت میں غایت درجہ کا تأثر تھا۔نیز ان کا دل سچائی اور خدمت کے جذبہ سے بھی معمور تھا۔اگر چہ حوادثِ زمانہ کی تلخی سے کما حقہ آشنا تھے مگر طبیعت میں زندہ دلی تھی۔قدرت نے اعلیٰ دماغ اور بہترین حافظہ عطا کیا تھا۔عربی ادب اور عربی ثقافت سے گہرا شغف رکھتے تھے۔

حافظ کے شعر میں موسیقی کے ساتھ ساتھ ایک سوز بھی ہے چونکہ خود غم دوراں کے ستائے ہوئے تھے اس لئے قوم کے رنج ومحن کو اپنا غم پنہاں سمجھا اور اس کی عکاسی اپنے اشعار میں اس طرح سے کی گویا تمام انسانیت کے غم پر ماتم کر رہے ہیں۔اسی وجہ سے ان کے اشعار میں تاثیر کی طاقت غالب ہے۔طرز بیان سادہ اور دلکش ہے اور الفاظ پر قدرت کاملہ حاصل ہے۔بایں وجہ اُن کی شاعری باعتبار فن بھی ممتاز ہے۔حافظ کو اگر سماج کا شاعر کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا کیونکہ سماج کا مطالعہ گھر بیٹھ کر کتابوں کے ذریعہ سے انھوں نے نہیں کیا بلکہ عوام کے ساتھ رہ کر اور ان کے مصائب میں شریک ہوکر کیا۔اپنے اشعار میں سماج کی خرابیوں کی طرف بانداز احسن اشارہ کرتے تھے اور پھر ان سے بچنے کی ترغیب دیتے تھے۔چنانچہ انھوں نے جابجا باہمی نا اتفاقی، غیر قوموں کی مداخلت اور عربی زبان وثقافت کی ابتری پر اشعار کہے ہیں اور اخلاقی جذبات کو اُبھارا ہے۔حقیقت یہ ہے کہ ان کے اشعار میں محض ماضی کا اندھیرا ہی نہیں ہے بلکہ روشن مستقبل کی جھلک بھی ہے۔

نازک الملائکۃ

۱۹۲۳ء

نازک الملائکہ کی پیدائش بغداد کے ایک امیر گھرانے میں ہوئی۔نازک الملائکہ نے ایک ایسے ماحول میں آنکھیں کھولیں جو علم وادب اور دولت کا گہوارہ تھا۔نازک کے والد صادق الملائکہ شاعر تھے اور اس کی والدہ ام نزار الملائکہ عراق کے مشہور شاعرات میں سے تھیں۔اس طرح اولاد میں بھی شاعری کا شوق بچپن سے ہی پیدا ہوگیا۔چنانچہ نازک کے دونوں بھائی احسان اور نزار بھی شعر کہتے تھے۔ابتدائی اور ثانوی تعلیم کے بعد نازک نے مدرسۃ المعلمین بغداد میں داخلہ لیا اور وہاں سے ڈگری حاصل کرنے کے بعد اس نے کچھ وقت امریکہ میں گذارا تا کہ انگریزی زبان وادب پر عبور حاصل کر سکے۔اپنے تین شعری مجموعوں ''عاشقة الليل'' ''شظايا والرماد'' اور ''قرأة الموجة'' کے علاوہ اس نے تنقیدی مضامین بھی لکھے ہیں جن میں معاصر شاعری کے رجحانات کا جائزہ لیا ہے۔وہ موصل یونیورسٹی میں عربی زبان ادب کے استاد کی حیثیت سے کام کر رہی ہے۔

نازک کی شاعری نازک خیالات، خوش آئند خواب، گہرے احساسات اور شیریں موسیقی کا مجموعہ ہے۔نازک الملائکہ نے زیادہ تر آزاد نظمیں لکھی ہیں۔

اشعار میں یاس وحرمان اور رنج وحسرت کی آمیزش ہے۔نازک معاصر عربی شعراء وشاعرات میں اہم مرتبہ کی حامل ہے جو زندگی کا کامل شعور اور فکر وفن کے مختلف مذاہب کا کامل ادراک رکھتی ہے۔